Name of Book:	CHANDINI KE PHOOL
Name of Author:	MOMIN KHAN SHAUQ
Year of Publication:	February, 1987.
Subject:	Poetry (On day to day life, Social and Economic Problems and National Leaders.
Rate of book:	Rs.16/-(Rupees sixteen only)
No.of pages.	128
Press:	Ajaz Printing Press, Chatta Bazar, Hyderabad.
Publisher and Author:	MOMIN KHAN SHAUQ
Address:-	"Ashraf Villa", 11-3-723, Mallapalli, Hyderabad-500001, (A.P.)

Signature:

چاندنی کے پھول

(شعری مجموعہ)

مومن خان شوق

سنِ اشاعت : فروری ۱۹۸۷ء

تعداد : ۷۸۶

بہ اعانت اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

کتابت : محمود سلیم

سرورق : محمد جعفر

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتّا بازار حیدرآباد

قیمت : سولہ روپے (Rs.16/-)

○

ملنے کے پتے :

- سیما پبلشرز اینڈ بک پروموٹرس، ۴۷۔ وینکٹ گیری نگر یوسف گوڑہ حیدرآباد
- ادبی مرکز، اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتّا بازار۔ حیدرآباد ۲
- حسامی بک ڈپو، چارکمان، حیدرآباد
- کمرشیل بک ڈپو چارکمان، حیدرآباد
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دِلّی، بمبئی، علی گڑھ
- مصنف : اشرف وِلا، ۱۱-۳-۷۲۳ روبرو جامع مسجد ملے پلّی حیدرآباد-۱

شریکِ حیات

کے نام

اور تحفہ

زرینہ
شاہین
اَشرف
اکبر
فرحانہ
رُخسانہ

کے لیے جو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

— مومن خاں شوق

چاندنی کے پھول فکرِ شوق کا اظہار ہیں
موسموں کا عکس ہیں، گفتار ہیں کردار ہیں

پھول پتیاں

نور و نکہت کا دِلاویز گلدستہ

زندگی، تغیرات اور تبدیلیوں سے عبارت ہے اور شعر و ادب کم یا زیادہ، ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ فن کار کی خوبی یہی ہے کہ وہ ان تغیرات اور تبدیلیوں کو متوازن اور موثر انداز میں قبول کرے۔ حالی کے عہد میں جدید شاعری کے رجحانات ہوں، ترقی پسند تحریک ہو یا اب جدیدیت اور دیگر میلانات، جن شاعروں نے ان کو یکسر رَد کیا وہ بھی بھلے میں نہ رہے اور جنھوں نے اُن کی کورانہ تقلید کی، وہ بھی ڈوبے، کچھ دیر کے لیے اپنے حواریوں سے تالی بجوا لینا اور بات ہے۔

مومن خاں شوقؔ، اِدھر گزشتہ لگ بھگ دو دہوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کوئی پانچ سال قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ "بدلتے موسم" شائع ہو چکا ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے دُنیائے شعر و ادب میں بدلتے موسم کا اثر اسی حد تک قبول کیا ہے جس حد تک کہ قبول کیا جانا چاہیئے تھا۔ انھوں نے بدلتے موسموں کو نہ تو قطعی نظر انداز کیا اور نہ وہ بدلتے موسموں کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کے ہاں مثبت شعری روایات اور ماضی کی صحت مند اقدار کی پاسداری بھی ہے اور عصری رجحانات کا احترام بھی ـــــــ انھوں نے ہر دو سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے اپنے شعری رویّہ کی تشکیل کی ہے۔ اس میں انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے اور کئی کامیابیاں حاصل کرنی ہیں ـــــ

مومن خاں شوقؔ نے ادبی طور پر خود کو کسی نظریہ یا تحریک سے وابستہ نہیں کیا لیکن زندگی دوست اور ترقی پسند رجحانات سے اُن کا کلام عبارت ہے۔ اُن کے ہاں انسان کے دُکھ درد پہ آنسو ہیں۔ اخلاقی قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے پر وہ احتجاج بہ لب ہیں روحانیت کے زوال پر ماتم کناں ہیں اور معاشی بحران پر وہ متوشش! انہیں احساس ہے کہ آج فرد کے خواب تعبیروں کے لیے دامن پسارے ہیں لیکن کہیں کوئی تعبیر نہیں ملتی اُمیدیں ناکام ہیں، ارمان تشنہ، آرزوئیں کہیں گوشے میں سر بہ زانو، شرافت شرمسار ہے اور تہذیب و تمدن اپنے نوحہ گر آپ!۔ شوقؔ نے اپنی بیشتر منظومات میں انتہائی دُکھی اور مغموم لہجے میں بے حد خلوص، شائستگی اور رچاؤ کے ساتھ ان پہلوؤں کی سمت اشارے ہی نہیں کئے، ان پر سوالیہ نشان بھی لگائے ہیں، احتجاج بھی کیا ہے کہ قاری، شاعر کا رفیق اور اس اخلاقی محاذ پر اُس کے ساتھ صف آراء ہو جاتا ہے۔ "کروٹ" "آج کے نام صبح کی منزل کی جانب" "کچھ بچے جھنکار تو ہو" "سراب آشنا" "زندگی کوئی کروٹ تو لے" "صبح و شام" "صحرا میں دِیا" اور "پھر کیا کریں؟" اُن کی ایسی ہی چند منظومات ہیں۔ میں یہاں خاص طور پر ان کی نظم "صحرا میں دِیا" کو نقل کرنا چاہوں گا کہ شوقؔ کے جذبات اور احساسات کا اندازہ ہو سکے

رات کا لمبا سفر، پرچھائیوں کا سلسلہ
گھُپ اندھیرا خوف کا
چاندنی کا جیسے ہر منظر دھُواں
خواہشوں کا کرب، تنہائی، چبھن
آسماں پر چاندیوں روشن لگے
جیسے کٹیا میں کسی مُفلس کے گھر جلتا دِیا

یاد بہ صحرا میں کسی آواز کا نغمہ لگے
منزلوں کا واہمہ، خوابوں کا زخمی سلسلہ

اپنی اپنی زندگی کا اپنا اپنا مرثیہ
اس سفر میں لوگ گم گشتہ ملے
جیسے صحرا میں دیا

لیکن شوق ان پیچ وخم سے ہراساں نہیں، مایوسی اور احساسِ پسپائی کو چھوتے بھی نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور تاریکی اور تاریک ہوتی جا رہی ہے۔ حالات منفی رُخ اختیار کر رہے ہیں اور کل ــــ کل کا تصوّر ہے ہی کس کے پاس؟ کون جانے، کل کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ اہم بات یہ ہے کہ شوق نے عزم وہمّت سے دوری اختیار نہیں کی۔ ان کے ولولہ و شوق کی شمعیں روشن ہیں اور ان کی اُمنگوں اور حوصلوں کا دریا چڑھا ہوا ہے۔ وہ ہمت نہیں ہارتے اُنھیں یقین ہے کہ کل آئے گا اور ضرور آئے گا ایک روشن سویرا لیے ہوئے۔ رنگ اور خوشبو سے مہکتا ہوا، بھرپور اور صحت مند۔ اُن کی نظموں میں ایسے کئی مصرعے ملتے ہیں جو اُن کے شوقِ فراواں اور عزمِ جواں کی آئینہ داری کرتے ہیں:

کل نیا سورج اُگے گا
میں جشنِ صبح گاہی تو منا لوں ــــ (جشنِ صبح گاہی)

کچھ سہی، لیکن قدم بڑھتے چلیں
راستے مہکیں، فضا گل ریز ہو
غنچے کھلیں
عزم کی قندیل، ظلمت میں جلے ــــ (عزم کی قندیل)

چلو کہ پھر سے میکدے میں زندگی کے نام
اہتمامِ جشنِ گُل کریں ــــــــــــ (زندگی کے نام)

اور نظم "دو آوازیں" کا یہ آخری حصّہ ؎

ہوا،
مغرور آندھی، سرپھری، برگشتہ، آوارہ
یہ کہتی ہے:
مسافر!
تو اسی سنسان وادی میں
چٹانوں کے جگر کو چیر کر تیشے سے جوئے شیر پیدا کر

تنہائی ــــ عصری شاعری کا ایک اہم موضوع سا ہے۔ شوقؔ کے ہاں اس موضوع پر نظمیں اور اشعار ملتے ہیں۔ شوقؔ کو تنہائی کا احساس شدید ہے۔ وہ ماحول کی بے تعلقی پر متردد اور متفکّر ہیں لیکن اس تنہائی نے اُن کے اندر کے انسان کو کھوکھلا نہیں کیا اور نہ یہ تنہائی شکست خوردگی کا نتیجہ ہے۔ عزم و ہمّت نے یہاں بھی شوقؔ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ شوقؔ کو یقین ہے کہ یہ رُت بھی بدل جائے گی۔ ویسے شوقؔ کے ہاں آج کی شاعری میں پائے جانے والے بیشتر موضوعات مثلاً شہری زندگی پر طنز اور جنگل کی سمت کا رجحان وغیرہ ملتے ہیں جنھیں اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

زبان و بیان کے تعلق سے بھی شوقؔ کا رویّہ معتدل اور متوازن ہے اُنھوں نے "اُردو کے "اُردو پن" کو پوری احتیاط کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ ہاں، ہندی شاعری بالخصوص ہندی گیت سے وہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

"بِرہ کی ماری" "برہ کی اگنی" "نئی برکھا" "اب کے برس جب ہولی آئی" اور "دیوالی آئی" جیسی منظومات اِس کا اظہار ہیں۔

میں نے شوقؔ کی شاعری کے جن اوصاف کی طرف نشاندہی کی ہے، اُن سے منظومات ہی نہیں ان کی غزلیں بھی عبارت ہیں۔ شوقؔ کو نظم اور غزل دونوں پر ایک جیسی مہارت حاصل ہے۔ غزلوں کے یہ چند اشعار ؎

آج حالات ہی کچھ ایسے ہیں	ساعتیں ڈوبتی سی لگتی ہیں
ہم ملاقات کو چلے تھے مگر	وہ ملے بھی تو فاصلے سے ملے
زندگانی کی الجھنوں کے سبب	ہم بھی اکثر تھکے تھکے سے ملے
لوگ تقسیم ہوئے ذاتوں میں	آدمیت کی کہاں بات اب کے
راستے اپنا چلن بھول گئے	ہم نے دیکھی ہے وہ برسات اب کے
پھر ایک بار تو ایسا ہوا کہ جنگل میں	ابھی نکل ہی رہا تھا کہ ڈھل گیا سورج

مجھے یقین ہے مومن خاں شوقؔ کا یہ مجموعۂ کلام "چاندنی کے پھول" نور و مہک کا ایک دلآویز گلدستہ ہوگا اور مستقبل میں اُن کی شاعری نور و مہک کی اور بلند منزلوں کی سمت رواں دواں ہوگی اور منوّر ہوگی اور مہکے گی۔

(پروفیسر) سُلیمان اطہر جاوید
صدر شعبۂ اُردو، ایس دی یونی ورسٹی
تروپتی (آندھرا پردیش)

۱۸۔ جنوری ۱۹۸۷ء

عرضِ شوق

دوسرا شعری مجموعہ "چاندنی کے پھول" پیشِ خدمت ہے۔ میں نے اپنی حیات اور شاعری کے بارے میں اپنے پہلے شعری مجموعہ "بدلتے موسم" میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ پھر بھی مختصراً عرض ہے کہ میں زرعی یونیورسٹی (راجندر نگر) کے شعبۂ حسابات میں منتظم ہوں۔ دفتر کے بعد میرا زیادہ وقت شعر و ادب نیز معیاری علمی و ادبی رسائل و جرائد کے مطالعہ و استفادہ کی نذر ہو جاتا ہے۔

اپریل ۱۹۸۶ء سے ادبی و شعری ادارہ "مرکزِ ادب" کا نائب صدر اور خازن ہوں۔ سالانہ مشاعرہ (یوم تاسیس، یکم نومبر ۸۶ء) کے موقع پر اوپن تھیٹر باغ عامہ حیدرآباد کے اسٹیج پر کلام سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ اور حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ نومبر ۸۶ء ہی میں اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے میرے دوسرے مسوّدۂ شاعری کو اشاعتی تعاون حاصل ہوا، جس کے لیے میں ریاستی اردو اکیڈمی کے اربابِ مجاز کا شکر گزار ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد کے نیرنگ پروگرام میں میرا کلام اکثر و بیشتر نشر ہوتا رہا ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ ۸ ر ڈسمبر ۸۶ء کو "حیدرآباد دور درشن" کے پروگرام میں نظم سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ ملک کے ادبی رسائل و جرائد میں میری شاعری بالعموم چھپتی اور پسند کی جاتی رہی ہے جس کے لیے میں مدیرانِ جرائد اور سخن فہم

اصحاب کا شکر گزار ہوں۔

شعر و ادب کے دیرینہ ذوق کو سمت اور معیار دینے میں محترم وقار خلیل کی رہنمائی کا میں تہِ دل سے مشکور ہوں۔ صاحبِ طرز اور بالغ نظر نقاد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے میری شاعری پہ حوصلہ افزا رائے سے بروقت نوازا۔ میں بہ صمیم قلب ڈاکٹر جاوید کی شوق نوازی پر ہدیۂ تشکر بجا لاتا ہوں۔

مولوی محمد عبدالکریم ماہر حیدرآبادی، برادرم عمر خاں (اسسٹنٹ انجینئر میونسپل کارپوریشن) محترم نقوی صاحب (منتظم زرعی یونیورسٹی) جناب محمد بشیر الدین صدیقی (برادرِ نسبتی)، جناب محمد جعفر بھائی (رفیق پریس)، جناب شریف بھائی (نیمس بلاک میکر)، جناب نور محمد (اعجاز پریس) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان اصحاب کے تعاون و اشتراک کی بدولت ــــ "چاندنی کے پھول" کی مہک افزوں ہوئی۔ جناب محمود سلیم (خوش نویس) نے توجہ اور پابندی کے ساتھ خوب تر کتابت سے اسے سنوارا اور سجایا اور جناب محمد احتشام الدین (جلد ساز) نے دیدہ زیب جلد سازی کا فریضہ بہ طریقِ احسن انجام دیا۔

آخر میں اس کتاب کو پڑھنے والوں اور ملک کے صاحبِ نظر ملت سے اس امر کا خواہش مند ہوں کہ وہ اپنی بےلاگ رائے سے نوازیں۔

مومن خاں شوق

(مومن خاں شوق)

اشرف ولا، ۱۱-۳-۲۳ ۷
ملے پلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

حمد

وہ جو موجود ہے ہمیشہ سے
اور رہے گا تا ابد
وہ جو فکر و نظر کا سرچشمہ ہے
وہ جو تنہائیوں میں ساتھ رہتا ہے
ہجُوم میں ذرا پرے چلتا ہے
کتابوں کے اوراق میں مِلتا ہے
دفتروں اور کارخانوں میں نظر آتا ہے
مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں میں
اپنا جلوہ دِکھاتا ہے
غریب کی کُٹیا میں رہتا ہے
بے ضمیروں کا اندیشہ
وہ جو سب سے بڑا ہے
تصوّر سے ماورا، حقیقت سے قریب
اُسی کے آگے سر جُھکاؤ

نعت

سرخرو ہیں دنیا میں آج فیضِ نسبت سے
سربلند کل ہوں گے اُمّتی شفاعت سے
قربِ حق کریں حاصل قربتِ رسالتؐ سے
عرش کے مقابل ہے آستاں محمدؐ کا

آہِ دل کسی صورت عرش تک نہیں جاتی
روشنی بصیرت کی قلب تک نہیں آتی
اور دُعا قبولیت کا شرف نہیں پاتی
واسطہ نہ ہو جب تک درمیاں محمدؐ کا

حادثے پشیماں ہیں اور سرنگوں طوفاں
چل رہی ہے تھم تھم کر نبضِ گردشِ دوراں
پاسبانِ قرآں ہے خود ہی خالقِ قرآں
حرف حرف ہوتا ہے جاوداں محمدؐ کا

عزم کی قندیل

زندگی : شعلہ کہ دھوپ
روشنی ، ظلمت ، خلش
کتنے چہرے رنگ روپ
حوصلوں کی آنکھ سے دیکھیں تو مہکے انجمن
بے دِلی ہر گام جیسے بے یقینی اور تھکن
کچھ سہی ، لیکن قدم بڑھتے چلیں
راستے مہکیں ، فضا گلریز ہو
غنچے کِھلیں
عزم کی قِندیل ظلمت میں جلے

خود آگہی

لکیریں
آڑھی، ترچھی
ملگجی، روشن عمودی
ہتھیلی کے چمن پر رقص فرما
برہمن کی طرح احوال بولیں
مسرّت، رنج و غم، خوشیاں
تمنّا، آرزو، حسرت
کئی نقشے، کئی منظر ابھارے
روپ کھینچے، رنگ چھوڑے
مگر میری لکیریں
خود مری تقدیر کا عکسِ دروں ہیں
لکیروں پر نہیں، خود پر بھروسا ہے

زندگی کے نام

لہو لہو حکایتیں
یہ رنجشیں، یہ نفرتیں
دِلوں سے دِل کے فاصلے
غم و الم کے سلسلے
شکایتوں کے مرحلے
جو ختم ہوں تو زندگی
مہک چلے، بہک چلے
اُداسیوں کی اوٹ سے
وفا کی رہگزار پر، حیات پھر مچل اُٹھے
بدل رہی ہیں ساعتیں
سمٹے سمٹے کی آہٹیں
نشاط کار منزلیں
چلو کہ پھر سے میکدے میں زندگی کے نام
اہتمامِ جشنِ گُل کریں

نئے آدرش کی تکمیل

ہواؤں کے مقابل سنگ ریزوں کی چبھن، اُلجھن
کسی احساس کے جذبے کی ریزہ ریزہ کیفیت کا اندیشہ
کچھ ایسا ہے زمانہ ریت کا آنگن ہے
بچوں کے گھروندوں کا تماشہ ہے
ہمیں بھی آرزوؤں کا محل اب کے بنانا ہے
چلو، یوں ہی سہی، جی تو بہل جائے
خرابے میں کوئی صورت تو نکلے کام بن جائے
ہواؤں کے مقابل شعلۂ احساس تابندہ رہے جب تک
نیا سورج، نئے آدرش کی تکمیل کو اُلجھن نہ سمجھے گا

اُجالوں کا سفر

ابھی جینے دو مجھے
کہ میں حالات سے ہوں برسرِ کار
زندہ رہنے کا ہنر اور اُلجھتی قدریں
راہ کٹھن ہے پھر بھی!!
کوئی روکے نہ مجھے
ہر خم و پیچ سے شاداں، فرحاں
جادۂ نو پہ رواں میری حیات
کتنی شاداب لگے ہے مجھے یہ بزمِ جنوں
یُوں بھی جاری ہے اُجالوں کا سفر
ہم قدم جیسے خرد، جہد کی پتوار لیے
بحرِ ہستی پہ رواں قافلۂ دانش و رنگ
مجھے اس طور سے جینا ہی بھلا لگتا ہے
وقت کا کیا ہے، گزرتا ہے صدا دیتا ہے
میں صداؤں سے بھی اُس پار گزر جاؤں گا
اپنی ہستی کو جگا پاؤں گا

صبح کی منزل کی جانب

ٹھیک ہے یوں ہی سہی
جب آئے ہو تو بیٹھو، دم لو
کہو، حالات کیسے ہیں؟
سناؤ کچھ نئی باتیں!
سُنو! ہم سے بھی کچھ آخر
غمیں چہرے تھکن یا خود فراموشی
کی باتیں، تمہیں دیکھا تو یاد آئیں
مگر پہلے: تر و تازہ تو ہو لو،
چائے پی لو ——
وہی حالات، اندیشے، وہی جھگڑے، وہی قصے
ہٹاؤ بھی یہ سب باتیں
مسائل، اُلجھنیں، قضیے
سمیٹو زندگی ایسے
تبسم کی کرن بجھنے نہ پائے
چلو چلتے رہو حُسنِ عمل کی رہگزر پر
صبح کی منزل کی جانب

گجر بجے جھنکار تو ہو

برسوں پہلے
ہم نے جو سپنا دیکھا تھا
اس کی کیا تعبیر ملی ہے
یہ کوئی بتلائے؟
اب بھی جیسے خواب ہمارے
اُکھڑے اُکھڑے لگتے ہیں
موسم، رنگ، تمنّا، دانش
کرن کرن خواہش کی کرچیں
رستہ رستہ تنہائی
تعبیریں کیوں سوتی ہیں
کوئی تو جاگے، کوئی تو چہکے
سنّاٹا آواز تو دے
گجر بجے جھنکار تو ہو

کروٹ

دن ڈھلتے ہی گہرے سائے
رات کے کالے سنّاٹے ہیں
در آتے ہیں:
تنہائی، بے چینی، وحشت
جیسے کالے کالے بھُوت
کروٹ کروٹ ڈستی اُلجھن
ناگن سے کرتوت
اس عالم میں:
جھلمل جھلمل صبح کا پرچم کھُلتے ہی
کالے کالے وحشی سائے
دُور کہیں کھو جاتے ہیں

ابہام

مرے پہلو میں آخر کون ہے
نغمہ کہ پیکر ہے
ترنّم ہے، تصوّر ہے، تخیّل ہے، سخن نا آشنا کیا ہے
میں خود سے پوچھتا ہوں
اور
تنہائی میں اکثر سوچتا ہوں:
احساس ہے یا پھر فقط اک واہمہ ہے!!
ذات کا ابلاغ، حاصل کا زیاں، ہمزاد کا پرتو

تنہائی میں

رات کی گہری تنہائی میں
سناّٹے کی چادر اوڑھے
میں بستر پر لیٹے لیٹے
کروٹ کروٹ سوچ رہا ہوں
نیند کہاں کھو جاتی ہے؟
جانے رات کی تاریکی میں
کدھر بھٹکتی پھرتی ہے؟
دیر گئے پھر
جانے کس پل
آنکھوں میں وہ آجاتی ہے!
اور میں
تھک کر سو جاتا ہوں
سپنوں کی دُنیا میں جیسے کھو جاتا ہوں!!

دو آوازیں

اکیلی، سانس لیتی تیرہ و تاریک وادی میں
صدا دیتا ہے اک بھٹکا ہوا سایہ
کبھی وہ چیختا ہے اور آوازیں لگاتا ہے
وہ سُنتا ہے تعاقب میں صدائے بازگشت اپنی
کوئی ہمدرد مِل جائے تو رو لے :
چٹانیں، وادیٔ خاموش کی تنہا چٹانیں
اُسے اپنی طرف آواز دیتی ہیں
ہَوا :
مغرور اندھی، سرپھری، برگشتہ آوارہ
یہ کہتی ہے :
مُسافر !
تو اِسی سُنسان وادی میں
چٹانوں کے جگر کو چیر کر تیشے سے جُوئے شِیر پیدا کر

اک تناور شجر
سایہ سایہ رفاقت کی چھتنار شاخوں کا مہکا ہوا سلسلہ
بادِ صرصر کی تحلیل ہوتی ہوئی بے بصر تیرگی
قطرہ قطرہ جسے روز پیتی گئی
وہ شجر، وہ تناور شجر
لمحہ لمحہ پگھلتا گیا:
اور رفاقت کی چھتنار شاخیں جُھکیں
بے ثمر، برہنہ سا شجر اک علامت بنا
زندگانی کا نوحہ سنانے لگا
بین کرنے لگا

اور

زمیں اپنے محور پہ رقصاں رہی

کرب کی تخلیق

سناٹا، تنہائی، یادیں!!
دور تک پھیلی ہوئی لمبی سی رات
خاموشی ڈسنے لگے

ایسے میں نیند
رات کی بے چہرہ تاریکی میں
کچھ ایسے لگے
جیسے سنّاٹا اُڑاتا ہو مذاق
ہنس رہا ہو مجھ پہ خود میرا وجود
سوچ کا یہ فاصلہ، قربت یہ دوری کا گماں
کتنے احساسات کو کرنے چلا ہے بے نقاب
ٹھیک ہے، اب سو رہیں کچھ نہ لکھیں
کرب کی تخلیق کو راحت مِلے

یہ بھی رُت بدل جائے

آگ کا سمندر بھی سرد سرد لگتا ہے
روشنی کا اک دیپک
یا خیال کا جگنو
اِن اُداس لمحوں میں
تشنگی کی آنکھوں میں
ٹمٹمانے لگتا ہے:
عکس ٹوٹ جاتے ہیں
رنگ روٹھ جاتے ہیں
ساعتیں بِسرتی ہیں
شبنمی، خنک لمحے
سرسرانے لگتے ہیں
منزلیں سراب ایسی کچھ دِنوں سے لگتی ہیں
یہ بھی رُت بدل جائے
آدمی اکیلا ہے اور غم رسیدہ ہے

رُوپ اَنُوپ

قطرہ ہوں، دریا ہوں
اور ہوں سمندر
بہتا رہا ہوں
کبھی اشک بن کر
تمنّا کی تکمیل کی لہر ہوں
میں بپھروں تو موجوں کی ہر ایک کروٹ
مہکتی ہوئی زندگی
کسی راکھشش کی طرح بھسم کردے
میں ٹھہروں تو!
آنکھوں میں کاجل بھی ٹھہرے
شگوفے کِھلیں، رقصِ مہتاب ہو

میرا فن

دھڑکنوں میں، خیالوں میں، فن میں
فکر و دانش کے ہر زاویئے میں
ایک ہی عکس اور شخص ٹھہرے:

وہ مرا کون ہے؟
اور رشتہ ہے کیا!
اس کو تم میری نظموں میں، غزلوں میں ڈھونڈو
وہ مری آرزو ہے
اور خوابوں کا مہکا نگر
نام کیا لوں، وہ سب جانتا ہے

چھوڑو
اب جانے بھی دو
اگر شاہین سے پانی کا گلاس
چھوٹ گیا
غصہ میں اتنا مت مارو
وہ تو بچّی ہے، بچّی!
اِس دُنیا میں :
کتنے ایسے لوگ بھی ہیں
جانے انجانے میں
اپنوں کے دل توڑ دیا کرتے ہیں

تبدیلی

چلو، ہم تم ذرا باہر چلیں، ماحول سے نکلیں
کلب چلتے ہیں
بیٹھیں، گفتگو کر لیں
وہاں سے جب اُٹھیں، پھر چلیں

پھر
سوچتے چہروں کے جُھرمٹ سے ذرا بچ کر
کسی خلوت میں کچھ لمحے گزاریں
تازہ دم ہو لیں
پھر اُس کے بعد روز و شب کے صحرا کی مسافت
اور وہی جلتی ہوئی تنہائیاں اپنا مقدّر ہیں

مساوات

تمہارے یہاں
الماری میں
قیمتی زیور، نوٹوں کے بنڈل
قرینے سے
رکھے ہوں گے

میری چھوٹی سی
ایک الماری میں
کچھ کتابیں، رسائل اور مسودے
سیاہ اور سفید چند کاغذ
بکھرے پڑے ہیں
سوچو
کون امیرانہ اور پرسکون زندگی جی رہا ہے

وہ لڑکی

وہ لڑکی
جسے روز میں دیکھتا ہوں
مہکتے چمن سی، شگفتہ پہیلی
چھریرے بدن کی!
تو اکثر یہ محسوس ہوتا ہے مجھ کو
غزالی نگاہوں میں اُلفت چھپی ہے
بہکتی اداؤں میں اک کیف جیسے
یہ نغمہ بنے اور چٹکنے لگے تو
نیا ایک موسم کچھ ایسے طلوع ہو
بہار آفریں ہو ہر ایک منظر

آج کے نام

یہ موسم کی رنگینیاں، رتجگے
نغمہ وشعر کی بادۂ وجام کی محفلیں
سب کے سب آج حالات میں
نفرتوں کے سلگتے سے لمحات میں
اور گرانی کے کہرے میں جلتے ہوئے
ایسا لگتا ہے زخموں سے ہم چور ہیں
کس دھندلکے کے صحرا میں مستور ہیں
کوئی آئے،
مُداوائے غم کچھ تو ہو

زندگی وقت کی آواز کبھی
اپنی ہمراز کبھی
سوز کبھی، ساز کبھی

... ...

یہ کبھی رنج والم
اور کبھی حسنِ وفا
باب در بابِ حکایت روشن

... ...

زندگی شعلۂ رخسانہ بھی ہے
زندگی کرب کا اظہار بھی ہے
زندگی عظمتِ کردار بھی ہے
دستِ محنت میں مُروّت کا گلگن
ظلمتِ غم میں اُجالوں کا چمن
اس سے روشن ہے سخن کا آنگن

۳۸

سراب آشنا

گجردم چمن میں
کھلا پھر گلاب
مگر رنگ اس کا

پریدہ پریدہ
کہ اب چاہنے والا کوئی نہیں
وفا آشنا کا یہ انجام ہے
تو پھر زندگی تجھ سے کیسی وفا
لطافت، تقدس، کرم، ارتقاء
کچھ ایسا ہے سب ہیں سراب آشنا

شاخ شاخ خوشبو

ہَوا، جو باغوں میں گُل کِھلائے
چمن چمن شاخ شاخ خوشبو
ہری ہری کھیتیوں میں پَودے
لہک لہک کر وفا کے نغمے سنائیں ایسے
کہ جیسے جھانجھن بجیں گجر دم،
تمھاری قامت کو چُھو کے نکلے
تو یوں لگے:
آرزو کا ہر شہر جاگتا ہے
خزاں کا عفریت بھاگتا ہے

نسیم اگر گیسوؤں کو چھو لے
روش روش ہوں گلاب روشن
قدم قدم چاندنی خراماں
بہار اِترائے، رقص فرما ہو حُسنِ گیتی
ہوا کی نرمی، ہوا کی ٹھنڈک
تمھاری چشمِ کرم کا مظہر
ہوا کے شانوں پہ نام دیکھو
تمھارا ہی تو لکھا ہوا ہے

سفر کی راہ میں ابھی

ابھی اِدھر
ابھی اُدھر
کبھی یہاں
کبھی وہاں
نہ سمت ہے نہ زاویہ
نہ کوئی راہ سامنے!!
بنے گا کون ہم سفر
تلاش ہی تلاش ہے
ہراس ہی ہراس ہے

سفر کی راہ میں ابھی
ملے گی مجھ کو روشنی
کھلے گی میری زندگی
جو ختم ہوگی تیرگی
وہ مشعلیں سی جل اُٹھیں
یقیں کی رہ نکھر گئی
وہ راستہ وہ منزلیں
وہ آگہی حیات ہے

پھر کیا کریں

ایک طرف
ہنگامہ
ہڑتالیں
جُلوس
بند
دھرنا
بائیکاٹ
مدرسے، دفتر، مشینیں، کارخانے، بے صدا
دوسری جانب
گرانی
چور بازاری

ملاوٹ

دانۂ گندم نہ تیل
اس پہ طرفہ
ظلم کا سورج جو یوں چڑھتا رہے
اس طرح مصلوب ہونے سے تو ہے بہتر یہی
خودکشی!
یہ بھی نہیں
پھر کیا کریں ——— ؟؟؟

ڈراما

تم غلط بات کہتے ہو
تم دوست ہو
تم کو احساس ہوتا !
تو کیا خوب ہوتا
چلو ــــــ
بات ادھوری سہی
چھوڑ دو
جب ملے ہو تو کافی ہی پیتے چلیں
یہ بتاؤ ــــــ
کہ اُس سے ابھی دوستی ہے
کبھی اپنے چہرے کو بھی دیکھتے ہو

بدن کی گپھائیں اگر جھانکتے ہو
تو بتلاؤ
کیا تم وہی شخص ہو!
جس سے مِل کر مجھے تو مسرّت ہوئی تھی
کہو،
کچھ تو بولو!!
چلو، آئینے سے ہٹو
اُس طرف آؤ، دیکھو
نئی صبح رقصاں نظر آ رہی ہے
غلط بات کہتے ہو
تم دوست ہو
یہ منظر تو یکسر سراب آشنا ہے
تمنّا کا ہر نقش اب بھی دھواں ہے

زندگی رُخ بدلتی ہے

زندگی
اَدھ کِھلی اِک کلی
جب کِھلی
گُل بنی
اور خوشبو ہواؤں میں
بِکھرا گئی ـــــــ
کھیلی خوشیوں میں
غم میں پَلی
اُلجھی حالات سے
وقت سے بِھڑ گئی

رو پڑی
ہنس پڑی
چلتے چلتے، اچانک
اک انجانے سے
موڑ پہ
جانے کیا سوچ کر
رُک گئی

اور
مُرجھا گئی
پھر جو جاگی
تو دُنیا نے دیکھا یہی
زندگی رُخ بدلتی ہے
مرتی نہیں

جشنِ صبح گاہی

راتؔ، اک ڈائن

سیہ، بدشکل رات

وہم کی کھڑکی سے

پھر کمرے میں ڈسنے آئی ہے

ہر طرف سناٹا، تنہائی، صدا، زخمی صدا

جھینگروں کا شور، عِفریتوں کی آہٹ

کرب، بے چینی، اکیلا پن

کوئی پتّہ اگر کھڑکے ـــــــ

لگے احساس جلتی رات میں یخ بستہ ہو جائے

کہاں ہیں نیند کی وہ اُجلی اجلی اَپسرائیں

سیمگوں مہکی ہوئی کلیاں

کہ میں اس رات سونا چاہتا ہوں

کل نیا سورج طلوع ہوگا

میں جشنِ صبح گاہی تو منالوں

جیون روپ

شعلے اُگلتا
صبح کا سورج
دن بھر
غم کی آگ میں
تپ کر، کُندن بن کر
شام کو
تھک کر
دُور کہیں آکاش میں
جیسے کھو جاتا ہے
....
کچھ ایسے ہی
اپنا جیون روپ بدلتا رہتا ہے
دن میں چلنا، شعلہ بننا
اور پھر شام سے پہلے تھک کر
اُلجھن بننا، سو جانا یا کھو جانا

ایک سوال

زمانے کے غم، زندگانی کی باتیں
گلے، اُلجھنیں، درد اور اضطراب
مراثی، حکایاتِ فریاد، نالے
کبھی پل دو پل کی یونہی سی مسرّت
تمنّا، سراب ایسی جھوٹی تمنّا
یہی باب ہیں آج کی زندگی کے
تو پھر ایسی تقدیر پہ ناز کیوں ہو۔
کوئی روشنی، کوئی حرکت
کوئی بات ہو
زندگی پھر نئی راہ پر چل پڑے

نشاطِ رہگزر آساں نہیں
منزل بہ منزل خود کو دُہرانا
جنوں زادوں نے سیکھا ہے بس اتنا
تیرگی میں شعلۂ رخسار چمکانا
ہمیں زندانِ شب میں کام تو کچھ اور کرنا ہے
شعورِ آدمی مہکے، نئی منزل بنے
جادہ کھُلے، رُخسار بھی چمکے
دھنک پھیلے تو یوں پھیلے
شفق بھی اُس پہ اِترائے
گجر تو بج چکا
چہروں پہ تابانی نمایاں ہے
مگر اک آرزو کا زخم بھر جائے تو اچھا ہو

صحرا میں دِیا

راتٗ کا لمبا سفر، پرچھائیوں کا سلسلہ
گھُپ اندھیرا خوف کا
چاندنی کا جیسے ہر منظر دھُواں
خواہشوں کا کرب، تنہائی، چبھن
آسماں پر چاند یوں روشن لگے
جیسے کٹیا میں کسی مفلس کے گھر جلتا دِیا!
یاد، صحرا میں کسی آواز کا نغمہ لگے
منزلوں کا واہمہ، خوابوں کا زخمی سلسلہ
اپنی اپنی زندگی کا اپنا اپنا مرثیہ
اس سفر میں لوگ گم گشتہ ملے
جیسے صحرا میں دِیا

سنّاٹے کی نبض

اندھیری رات کے سنسان، لمحوں میں
درِ احساس کی چوکھٹ پہ تنہائی کے سائے بڑھتے جاتے ہیں
سیاہ، تاریک وحشی رات جب
عفریت بنتی ہے —
شبیہیں سایہ سایہ رقص کرتی ہیں
کئی یادیں اُبھرتی ہیں
کئی آنچل خموشی کی رِدا بن
سرسراتے ہیں
کہاں کی نیند، کیسی آرزو
اِحساس کی ہر نبض جلتی ہے
تمنّا جس کو کہتے ہیں، خفا لگتی ہے دانش سے

جیون گیت

نَومیدی کی راہ گزر سے
جب بھی گزرو
آپ اٹھاؤ اپنا بوجھ
ہمّت خود منزل بن جائے
جراءت راہ دکھائے
قدم قدم گلزار کھلائے
جیون ہنستا جائے
سادھو، صوفی، سَنت کہے ہے
یگ یگ چلتے رہنا

زندگی کوئی کروٹ تو لے

زندگی، آج کی غمزدہ زندگی
جیسے، تپتا ہوا ایک صحرا لگے
آرزوؤں کی کرچیں نظر تا نظر
رہ گزر دھند میں جیسے لپٹی ہوئی
یہ خرابہ جو آباد تھا کل تلک
اب نہ شادابیاں ہیں نہ رنگِ جنوں
کچھ تو ہو،
زندگی کوئی کروٹ تو لے!!

صحراؤں کا سکون جاتا رہا

جب لوگ
شہر اور قریوں کی زندگی سے
عاجز آ گئے
اور
حادثاتِ زمانہ سے تنگ ہو گئے
تو اپنے گھروں کو چھوڑ کر
پہاڑوں اور وادیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے
اور پھر
مہکتی وادیوں اور صحراؤں کا سکون بھی جاتا رہا

دو رنگ

عشق روشن ہو گیا
شعلہ بنا
پھر بجھ گیا
راکھ کا حصّہ ہوا
تشنگی حد سے بڑھی
اور آگ کا دریا ہوئی
پھر یک بیک ———
بدلی جو رُت
چاروں طرف تھی برف سی

ایک نظم

(بے کاروں کے نام)

مختصر زندگی
کام پھیلے ہوئے
آرزوؤں کا آنچل مہکتا ہوا
خواہشوں کا سمندر تلاطم بپا
روز و شب انہماک
کام ہی کام، چہرہ نہ ربط
یہ زمانہ مشینی زمانہ جو ہے
بھول کر بھی رفاقت نہ دُہراؤ تم
جس طرح بن پڑے
خود کو مصروف رکھو:
کام سے ربط ٹوٹے تو سب ڈھیر ہے
اور چاروں طرف جیسے اندھیر ہے
کام ہی زندگی، کام ہی روشنی

دو نظمیں

پتھروں کی بستی میں
چُپ رہو تو بہتر ہے
کچھ اگر کہو گے تم!
حرف لَوٹ آئیں گے
چوٹ دے کے جائیں گے

○

مشینی زندگی
بے کیف لمحے
بے بدن چہرے
ساعتوں میں انتشاری کیفیت
جیسے بجلی بند ہو
اور وقت کی رفتار رُک جائے

چاروں جانب صحرا صحرا

بھولی بسری یادیں
نٹ کھٹ، کومل، شیتل
کتنے فسانے دُہراتی ہیں
بھیگے موسم، گزرے لمحے
کِھلتی کلیاں، چاند ستارے، سپنے سہانے
باغوں میں چُھپ چُھپ کر ملنا
تنہائی میں باتیں کرنا
ڈالی ڈالی پھول کِھلانا
پنگھٹ پنگھٹ پیار کی باتیں
رُت البیلی، چنچل موسم

اب ایسا ہے:
تنہائی ـــــــ دونوں کا مقدّر
تم بھی حیران، میں بھی پریشاں
چاروں جانب صحرا صحرا

تم جو آؤ

شکوے، وعدے، بیتے قصّے
رنگ بھری وہ اگلی راتیں
مدھر مدھر وہ پیار کی باتیں
گزری یادیں ______
تنہائی کا اب یہ عالم!
رہ رہ کر تڑپاتا ہے
نیند بھی ایسے میں آنکھوں سے جیسے گریزاں لگتی۔
رات کے سنّاٹے میں ہر سُو
خاموشی ہی خاموشی ہے
آنکھوں میں تنہائی سجی ہے
رات مسلسل کرب بنی ہے
تم جو آؤ
گلشن مہکے
ڈالی ڈالی پھول کھلیں

رُت بدلی

بچپن بیتا آئی جوانی
پڑھ لکھ کر جب ہوئی سیانی
من درپن میں ——
سُندر سی اک بسی تھی مُورت
بن کے حقیقت سامنے آئی

پہلے پہلے تو شرمائی
پھر گھبرائی اور لجائی
نین ملن کی باتیں مہکیں
گھونگھٹ میں جب راتیں مہکیں
ہوتے ہوتے ہم دونوں کی ہوئی سگائی
رُت بدلی میں ہوئی پرائی
آنگن چھوٹا
بابُل سے ساجن کی نگری
چل نکلی میں دلہن بن کر

موسم آئے جائے

موسم آئے جائے
ساون، بھادوں، پت جھڑ
پھر ساون ...
موسم آئے جائے
سمئے جو بیتے
پھر نہ آئے
جیسے
جوانی جائے
واپس
پھر نہ آئے

برہ کی اگنی

سہیلی!
کتنی ہے ناداں سہیلی
سانجھ سویرے باغ میں جائے
ٹہنی ٹہنی، کونپل کونپل
کیاری کیاری سے کچھ پوچھے
بھید نہ کھولے، گم صُم گم صُم
من ہی من میں ہنس لے، بولے
تن میں سُلگتی جائے

تارے گِن گِن رات بِتائے
کچھ نہ بولے
بِرہ کی اگنی ساون رُت میں
جانے کس کو ڈھونڈے
جب سے گئے پردیس سجنوا
بھید نہ کھولے
ناداں، پگلی!

کال

صدیوں سے پیاسی
یہ دھرتی ـــــ
چوس چکی ہے سارا پانی
پھر بھی ہے پیاسی
شہر میں دیکھو
گاؤں میں دیکھو
سوکھ رہے ہیں
ندی، نالے اور تالاب
قحط بھی ہے اب
ڈیرا ڈالے
بھوک ـــــ بھی
ننگی ناچ رہی ہے
محنت کش ـــــ

ترسیں روٹی کو
اور کہیں پر
تڑپیں لوگ
بُوند بُوند پانی کو یارو
اب کے برس کیوں کال ہوا ہے
کیسا یہ بھونچال ہوا ہے
دُور کہیں ـــــــ
آکاش پہ بیٹھا
دیکھ رہا ہے
سارے تماشے

اوپر والا
سوچیں
سمجھیں
غور کریں ہم
آخر
ایسا کیوں احوال ہوا ہے
پانی کا کیوں کال ہوا ہے

نئی برکھا

ٹھنڈی ٹھنڈی پَون چلی
تب من جھُوما تن بھی جھُوما
گاگر میں ساگر لہرائے
گوری کی انگیا مسکائی
رُت کیا بَدلی
پائل چھنکے ، نج اُٹھی چھاگل
اُمڈے کالے کالے بادل
چلی پَون ، پروائی

۷۰

باغ، بغیچے، کونپل کونپل
رنگوں کی پھلواری
من کا پنچھی، تتلی کے سنگ جھومے ناچے
گیت، غزل، افسانہ سنائے
من موجی لہرائے
غزلیں شوق کی گائے
بدلے ہوئے حالات میں برکھا
نیا سندیسہ لائے
پیار کی جوت جگائے

کاش

برفیلے جاڑوں میں
کہر میں آئی نشیلی رات
تنہائی، سناٹا اور دوریاں
وقفے وقفے سے سرد ہوا کے جھونکے
کپکپاتے ہونٹ
ایسے میں یادیں ـــــــ
ملاقاتیں، سوغاتیں اور جذبات کی گرمی
کاش
تم بدیس سے لوٹ آتے
یخ بستہ لمحے، لہلہا اٹھتے
بہار آجاتی اور چاروں اور نغمے بکھر جاتے

برہ کی ماری

پریم کی اگنی، شعلہ شعلہ جب بڑھتی ہے
جی جلتا ہے، من کی کلیاں مُرجھاتی ہیں
رستے بوجھل لگتے ہیں

... ...

ساجن: راہ کو تکتے تکتے
رین جدا ہو جاتی ہے
برہ کی ماری: ساون رُت میں
آنسو موتی رو جاتی ہے
ساجن: اتنی بنتی سُن لو
اِس رُت میں آجاؤ نا
من مندر میں سماؤ نا
من کی سونی بگیا میں کچھ پھول کھلیں
غنچے مہکیں، کوئل بولے
رُت مہکے ہریالی ہو

زینہ زینہ بڑھتے جائیں

پُرکھوں نے ہمارے
دے کر تن من دھن اور جان کی بازی
توڑی تھی زنجیرِ غلامی
حاصل کی تھی جو آزادی
ہم نے اُس کو کیسے سنبھالا
آؤ دیکھیں ـــــــ
فرقہ وارانہ جھگڑوں میں
اپنی اپنی غرض کی خاطر
بھائی کو بھائی سے لڑا کر
خون سے اُن کی ہولی کھیلی

راشن، غلّہ، تیل اور گندم
سب کو چھپاکر، دام بڑھاکر
یہ اُردو، یہ ہندی، تلگو
کہہ کر ہم نے وقت گنوایا

... ...

اب بھی وقت ہے ہم سب سنبھلیں
کیا ہندو، کیا مُسلم، کیا سِکھ اور کیا عیسائی
آپس میں سب بھائی بھائی
مل جل کر ہم قدم بڑھائیں
زینہ زینہ بڑھتے جائیں
مشکل میں بھی سنبھلتے جائیں
یک جہتی کی راہ پہ چل کر
ملک کی ہم قسمت کو سنواریں

نیا دَور

کِھل اُٹھا صحرا کہ موسم اب بہار آثار ہے
ہر سخن جوشِ نمو سے مطلعِ انوار ہے
اب سے پہلے سازشیں، دھوکے
حقارت، تیرگی، رنجیدگی
یُوں مسلط تھی کہ چہرہ تک نظر آتا نہ تھا
اب ہر اک منظر سجا ہے
فن کی، محنت کی، قلم کی بڑھ گئی توقیر ہے
بام پر دیکھو جدھر، تنویر ہی تنویر ہے

میرے زمانے کے پارسا لوگو

سکوں تلاشنے نکلا تھا، اب سے پہلے رشی
وہ کون تھا ___
وہ کہاں چھپ گیا، اُسے لاؤ
بُلاؤ، پوچھو!
وہ دیکھے، مِرے زمانے کو
میں اپنے گھر میں، شکستہ دیار میں تشنہ
بجھی بجھی سی اِن آنکھوں سے دیکھتا ہوں، مگر
سُجھائی کچھ نہیں دیتا طلسمِ زنداں میں
نہ عکس و رنگ و نظر اور نہ کوئی جسم و جاں
کوئی تو آئے صبا کی طرح، بہار کے رنگ
میں منتظر ہوں،
وہ آئے گا، کون آئے گا
وہ کون ہے، وہ کہاں ہے، نظر نہیں آتا
میں اپنے عہد کا گوتم ہوں اور تنہا ہوں
مجھے تلاش ہے نِروان کی کہاں جاؤں
بتاؤ میرے زمانے کے پارسا لوگو!!

آندھرا دیس ایکتا کا نگر

ایکتا کے کنول کھلیں گھر گھر
ہر گلی جشن ہو، چراغاں ہو
پیار کے گیت، امن کی باتیں
آگہی کے نئے وسیلے بنیں
نئی دنیا میں اس طرح سے جئیں

شہر، دیہات، گاؤں، بستی میں
زندگی کا شعور رقصاں ہو
آدمی آدمی کو پہچانے
جہد و محنت پہ اعتماد بڑھے
پیار کی چاندنی مہکتی رہے

مذہبوں کے جنون مٹ جائے
اور "ڈرامہ" یہ ختم ہو جائے
عہدِ جمہوریں ہر لب پر
زندگانی کے گیت رقصاں ہوں
اب کے اِس طور سے چراغاں ہو

کوئی بھوکا رہے نہ ننگا رہے
خوف باقی رہے نہ دنگا رہے
ہر نفس شاد کام، فرحاں ہو
آندھرا دیس، پیار کا درپن
تلگو اُردو کا خوش ادا گلشن

قطب شاہی شعور کا آنگن
حیدرآباد ہے مرا مسکن
ہر قدم زندگی، خلوص، وفا
میری دھرتی خرد کی بستی ہے
سب سے پیاری ہے اور اچھی ہے

سرزمینِ دکن

شوقِ اَرضِ دکن　　یعنی میرا وطن
شاہدانِ چمن　　گُل رُخ و گلبدن
دلکش و خوب رُو　　چاندنی سے بدن
حُسن میں شوخیاں　　عشق میں بانکپن
پیر ہوں یا جواں　　سب ہیں مستانہ پن
ہندو مُسلم یہاں　　جیسے گنگ و جمن
یوں ہیں قومیں یہاں　　جیسے پھُولوں کا بَن
گولکنڈہ ہُنر　　چارمینار فن
جامعہ کی مہک　　رشکِ مشکِ ختن
مَسکنِ اَولیاء　　مرکزِ عِلم و فن
ہیں سراج و ولی　　صدرِ بزمِ سخن
کارناموں سے ہے　　جگ میں نام دکن
تلگو، اُردو یہاں　　انجمن — انجمن
شوقِ رشکِ شفق　　میرا رنگِ سخن!

★

موت کا رقص

(بند اور کرفیو کے پس منظر میں)

۳ تا ٦۔ اپریل ۱۹۷۸ء کے نام ...

زندگی کرب میں سہمی سہمی
ہر قدم خوف و ہراس
دور تک موت کے کالے بادل
آگ، دھواں، چیخ، پکار
رائفل، وردیاں، سناٹا، جلن
سب کے چہرے پہ ہراسانی کے آثار ملے
زندگی جیسے نگوں سار لگے

جس نے بھی دیکھے قیامت کے سے منظر دیکھے
ظلم بڑھتا ہے تو گھٹ جاتی ہے تقدیسِ وفا
خون بہتا ہے تو تاریخ پہ حرف آتا ہے
عہدِ جمہور میں انسان کی عظمت کے نقیب
کرفیو ایسے مسائل کا مداوا ڈھونڈیں
بربریت کی فضا ختم ہو، مہکیں گلزار
پھر کوئی شہر، نہ صوبہ نہ علاقہ جلائے
دیس میں چاروں طرف پیار کا پرچم لہرائے

اُردو کی فریاد

میں اُس تہذیب کی پروردہ ہوں جس نے
غلامی کے اندھیرے میں صدا دی:
حوصلوں کو زندگی بخشی
تمدن اور ثقافت کو توانائی عطا کی
سحر زادوں کی محفل میں مجھے سب جانتے ہیں
اور پھر انجان لگتے ہیں
وطن میں اجنبی ہوں
اپنے دُکھ میں کس کو دکھلاؤں!!
میرا کوئی علاقہ ہے نہ گھر لیکن
میں ہر خطّے میں ہوں
کوئی مجھے تسلیم تو کر لے

۔ اِدھر کچھ دن سے یُوں ہے
روابط کو بڑھانا چاہتے ہیں
سیاسی مصلحت سمجھوں کہ اس کو وقت کا اک فیصلہ جانوں
میں سمجھوں بھی تو کیا سمجھوں !!
یہ منظر کچھ تو روشن ہو
کوئی چہرہ فروزاں ہو تو شاید روشنی کا مسئلہ حل ہو،
یہ کرنیں، ٹمٹماتی سی، خفی اور منحنی کرنیں
اُجالوں کا قبالہ بھی تو ہو سکتی ہیں!!
پھر تو ٹھیک ہے صاحب!!

پیامِ ماہِ صیام

نیکیاں جتنی ملیں
سب بانٹ لو
آسماں سے آ رہی ہے اک صدا
"نیک بندو! اِس مہینے میں رکھو روزے مدام"
اپنی پیشانی جھکاؤ عجز سے
اُس کے آگے جو زمین و آسمانوں کا خدا ہے
پاک اور بے عیب ہے
اُس کی حکمت، اُس کی دانش کے کئی منظر کھلے ہیں
روزہ دارو، تم پہ رحمت ہو،

نوازش بیکراں ہو
غمگساروں کے لیے آگے بڑھو
نیکیوں سے اپنے دامن کو بھر دو
اِس مہینے میں کئی برکات ہیں
چند روزہ زندگی ایسی جیو
ربّ بھی خوش ہو اور زمانہ بھی ہو تم سے مطمئن
شیطنت سے کر کے توبہ اس کے آگے خم تو
آسماں سے آ رہی ہے یہ صدا :
نیک بندو! تم خدا والے بنو!!

عید کا دِن

مہکتی ساعتیں، گُل رنگ چہرے
مسّرت ہی مسّرت رقص فرما
جبیں روشن
دِلوں میں نور ایماں کا
وہی افضل، وہی اکمل
اُسی کا نام باقی اور سب فانی
اِسی اقرار کی تفسیر ٹھہرے زندگی اپنی
کچھ ایسے ہی مناظر عید میں ہم کو نظر آئے
غنی، محتاج سب خوش خوش
مسرت ہر طرف رقصاں
یہ ساعت
اور روشن اور روشن اور روشن ہو

اَب کے برس ہولی جب آئی

اب کے برس رنگوں کا موسم
بھلا بھلا سا لگتا ہے
رُت کیا بدلی
چہرہ چہرہ پھول کِھلے ہیں
مکتب مکتب جشنِ چراغاں
پنگھٹ پنگھٹ حُسنِ غزالاں
مزدوروں کے چہروں پر بھی
صبحِ بہاراں کا منظر ہے
اب کے برس ہولی جب آئی
رنگ اور نور کے ساغر لائی
بِندیا چمکی اور چُنریا رنگوں میں اِترائی
سجنی گھونگھٹ میں مسکائی
اب کے برس ہولی یُوں آئی
رنگ اور نور کے ساغر لائی

دیوالی آئی

پھر دیپ جلے
دیوالی آئی
ایک سندیسہ لائی
بستی بستی پیار امر ہے
نگری نگری پھول کھلیں
بگیا مہکے
آنچل آنچل مسکانیں
گھونگھٹ، چہرے، چاند ستارے
جوت امر ہو
جتنے دکھ ہیں سکھ میں بدلیں
چہرہ چہرہ شادابی
دیوالی سندیسہ لائی
دیوالی آئی

بہادر شاہ ظفر

وہ پہلا سورما
جس کی بزرگانہ قیادت نے
وطن کو بیکراں عظمت عطا کی
اور آزادی کی دولت سے نوازا
وہ ایسا حکمراں
جس کی دِلوں پر حکمرانی تھی :
شرافت کا نمونہ اور رواداری کا سرچشمہ
فقیر و بادشاہ، شاعر
جسے غربت میں بھی یادِ وطن رنجور کرتی تھی
حدیثِ دل کو زنداں کے در و دیوار پر لکھ کر
بہادر شاہ نے ہندوستاں کی آبرو رکھ لی
ظفؔر کو ہم بصد اخلاص ہر دم
یاد رکھیں گے

عطرِ مجموعہ

(پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم)

وہ عالِم تھا، وہ انساں تھا، وہ دانش کا گلِ تر تھا
اُجالوں کا سمندر، صبح کی تنویر
باغ فکر و دانش کی مہک
اِن سب کا عطرِ مجموعہ تھا
وہ جو ہم میں نہیں ہے،
مگر اس کی نظر، وہ جستجو وہ نقدِ فکر و فن
ادب کی، شعر کی، تہذیب کی، تاریخ کی گلپوش وادی میں
نیا جادہ، نئی منزل، نیا رستہ دکھائے گی
مہک اُس عطرِ مجموعہ کی ہم سب کو لبھائے گی
کِھلیں گے آئینہ در آئینہ اسرارِ سربستہ
سخن لکھتا رہے گا احتشامِ فن کا افسانہ

ورثہ

(سید سجّاد ظہیر کی یاد میں)

اک ایسی شخصیّت ہم سے بچھڑ کر
روشنی کا، پیار کا، اخلاص کا جادہ بنی ہے
سخن، افسانہ، تہذیب اور ثقافت

رواداری، محبّت اور محنت
ترقی، امنِ عالم کی شرافت
یہ سب اُس شخصیّت کی فکر و فن کا ایسا ورثہ ہیں
جنھیں آگے بڑھانا ہے، جنھیں تابندہ رکھنا ہے

تو پھر اے غم زدو! مصلوب لوگو!!
قلم کو آگہی کی روشنائی میں ڈبو کر
ادب لکھتے رہو —
تہذیب کو تحریر میں لاؤ
سخن کے پھول مہکاؤ
جنوں کو آگہی بخشو
تو ممکن ہے وہ شخصیت جو اب ہم میں نہیں ہے
رُوح کو اس کی قرار آئے

باپو کی یاد میں

اُسے یادوں کے زینے سے اگر دیکھو
وَفا پیکر لگے
تمنّا کا صنوبر، چاندنی کا عکس
احساسِ نظر کا آئینہ خانہ
وہ مَر کر بھی امر ہے
کہیں آنسو گرے وہ یاد آئے
کہیں چاقو چلے سینہ سپر ہو
وطن کی آبرومندی کی خاطر
مصائب جھیل کر اہلِ وطن کو
چلن جینے کا کچھ ایسے سِکھایا
مِرا ہندوستان خلدِ بریں ہے
یہ سب باپو کی محنت کا ثمر ہے
نیا بھارت تمنّا کا نگر ہے

نہرو

روشنی، پیار، خوشبو
وفا، آگہی ——
سب ہیں مشکل سے ملتی ہیں یہ خصلتیں

ہاں، مگر ہم نے دیکھی ہیں
ایک شخص میں

امن کی روشنی
پیار کی چاندنی

آگہی سے عبارت نئی زندگی
اِس کا اخلاق، اُس کی وفا یاد ہے
وہ جواہر جو موتی کا اک لعل تھا
نام نہرو تھا
اس میں سبھی خصلتیں
پھول کی پتیوں کی طرح
ایسے پیوست تھیں
جیسے ہندوستاں
متحد اور معطّر سدا جاوِداں

مینارِ عظمت

(اندرا گاندھی کی یادیں...)

امر ہے اندرا گاندھی
جو تھی مینار عظمت کا
فضاؤں کو وطن کی، صبح کا جس نے چلن بخشا
روایاتِ کہن کو حوصلوں کا بانکپن بخشا
اُسی کے حوصلے کی چار سُو ہے چاندنی چھٹکی
تدبّر بے مثال اُس کا، قیادت بے نظیر اُس کی
وہ ہمدرد زمانہ تھی، مساوات اُس کا نعرہ تھا
وہ پیکر تھی اخوّت کا، پیمبر امنِ عالم کی

... ...

رواداری، شرافت، دانش و حکمت
اُسی کی وسعتِ فکر و نظر کا ہیں یہ سب ورثہ
جنھیں آگے بڑھانا ہے جنھیں تابندہ رکھنا ہے

تو پھر اے مرے ہم وطنو!
عمل کو آگہی کی روشنی دے کر
جنوں کو ضبط میں لاؤ
خرد کا نور برساؤ
مٹاؤ بربریت کو ـــــ
خلوص اور پیار آپس میں بڑھاؤ
وطن میں ایکتا کے پھول مہکاؤ
تو ممکن ہے ـــــ
کہ روحِ اندرا کو بھی قرار آئے
وطن میں پھر بہار آئے

فخرِ وطن

(... فخرالدین علی احمد مرحوم کی یاد میں)

وفا نہاد، سراپا خلوص، عجز تمام
وہ جس کی ذات تھی فخرِ وطن، نشاطِ وطن
وہ اب نہیں ہے مگر اُس کا جذبۂ خنداں
خلوص، پیار، وفا، آشنا طریق تمام
جو یاد آتا ہے آنسو چھلکنے لگتے ہیں
دِلوں کی بزم بھی نم دیدہ اور اُداس لگے
شرافتوں کا صنوبر، وہ فخرِ دین و وطن
گزر گیا ہے کچھ ایسے کہ یاس لگتا ہے
وہ صدرِ انجمن دل گرفتگاں کہ جسے
تمام عمر رہا آگہی سے رشتہ جلی
وہ اُٹھ گیا ہے تو ہر آنکھ میں نمی سی ہے
دِلوں کی بزم میں جیسے کوئی کمی سی ہے

آفتابِ سخن

(فراقؔ گورکھپوری کی یادیں)

وہ ایک دور تھا
تہذیب و فن کی عظمت تھا
چراغِ دانش و بینش تھا آفتابِ سخن
شعورِ ذات کی گہرائیوں کا نبض شناس
کچھ اس طریق سے لکھتا رہا حدیثِ جنوں
تمام فلسفہ و فکر اس کا آنگن تھا
حدیثِ درد کا احوال اس ادا سے لکھا
غمِ حیات، غمِ کائنات جیسا لگا
تمام آنکھیں ہی آنکھیں تمام حُسنِ کلام
وہ دیدہ وَر جو ہماری صدی کا شاعر تھا
بہت عظیم، نہایت اہم سخنور تھا
بساطِ شعر و ادب پر گھٹا سی چھائی ہے
شعورِ نغمہ کو جیسے کہ نیند آئی ہے

افتخارِ فکر و فن

(فیض احمد فیضؔ کی یادیں)

وہ رازدانِ علم و فن، ادب نواز شخصیت
وہ افتخارِ فکر و فن
روایتوں کا گلستاں، شرافتوں کی انجمن
اِدھر اُس کی زندگی تمام: حوصلوں کا بانکپن
ورق ورق حدیثِ گل، کتابِ آرزو تمام
لکھا گیا قلم قلم، وفا کی داستانِ غم
نگر نگر بکھر گیا، شاعری کا ترجمان
سفیرِ دانش و خرد، جنوں پسند طبع تھا
وہ اُٹھ گیا تو یُوں لگا
قلم قلم تہی ہوا،
ورق ورق الگ ہوا
سخن سخن غمیں ہوا

غزلیں

اور

قطعات

ع "دورِ حاضر میں غزل لکھنا دُعا ہو جیسے"

ہے رہگزر تو وہی پر وہ رہنما نہ
بجے جیب کہیں، درد آشنا نہ

اب اُس کی یاد ہی جی لیں کہ رات کٹ جائے
وہ روشنی تھا مگر اُس کا سلسلہ نہ مِلا

صِلہ کی فکر، نہ پرواہ کسی ستائش کی
ترے خلوص کی دولت مِلی خزانہ مِلا

بہا کے لے گیا سیلاب اس طرح سب کچھ
متاعِ درد کا کوسوں کہیں پتا نہ مِلا

تلاش کرتے رہے صاحبِ جُنوں کو مگر
بہت سے لوگ ملے کوئی باخدا نہ مِلا!

عجیب موسمِ گُل ہے بھری بہار میں شوق
کسی درخت پہ غنچہ کوئی کِھلا نہ مِلا

صورتیں اجنبی سی لگتی ہیں
چاہتیں بھی نئی سی لگتی ہیں

غمِ دل ہو کہ لب کی مسکانیں
ظاہری ظاہری سی لگتی ہیں

راستوں نے تھکا دیا اتنا
منزلیں ٹوٹتی سی لگتی ہیں

جب ملے ہیں یقین آیا ہے
ساری باتیں سنی سی لگتی ہیں

آج حالات ہی کچھ ایسے ہیں
ساعتیں ڈوبتی سی لگتی ہیں

جھیل آنکھوں میں صورتیں جیسے
شوق کو ڈھونڈتی سی لگتی ہیں

آشاؤں کے دیپ جلے تھے ساون رُت میں
غزلیں دوہے گیت لکھے تھے ساون رُت میں

گلشن گلشن، پنگھٹ پنگھٹ، آنگن آنگن
آنچل آنچل پھول کھِلے تھے ساون رُت میں

ڈالی ڈالی ہو آئے تنہا ہی رہے دلبر نہ ملا
ڈھونڈنے اُس کو ہم بھی گئے تھے ساون رُت میں

ویرانوں میں جشنِ چراغاں برپا تھا
سنّاٹے گُل رنگ بنے تھے ساون رُت میں

باغ، بغیچے، جنگل صحرا، دریا وادی
قدم مِلا کر ساتھ چلے تھے ساون رُت میں

بھیگے تن جب تیر کے نکلے شوق مزا کیا آیا
دیکھ کے ہم کو لوگ جلے تھے ساون رُت میں

یادوں کے بام و در سے اک چہرہ ضوفشاں ہے
رت بھی ہے بھیگی بھیگی مستی بھرا سماں ہے

جسموں کی چاندنی میں، پھولوں کی داستاں ہے
چاہت کے بول بولو' اب رات بھی جواں ہے

غصّے میں بھی ہمیشہ لگتی ہو موہنی تم!
پلکوں پہ ماہ و انجم، عارض پہ کہکشاں ہے

احساسِ دردمندی انسان کا ہے جوہر
اخلاص ہو جہاں بھی انسانیت وہاں ہے

فرقت کی تیرگی میں امید کا اجالا
بے درد سی فضا میں یہ کون مہرباں ہے

وہ گیت ہو غزل ہو، قطعہ ہو یا رباعی
لہجہ ہے سب کا شیریں یہ شوق کی زباں ہے

شام آئی ہے دُور سے چل کے
ساقی اب پیمانہ چھلکے

وجد کا عالم رنگیں لمحے
شعر ہوں جیسے میری غزل کے

وقت نہ دے گا ساتھ کسی کا
خواب نہ دیکھو تاج محل کے

راہی یہ ہے راہِ محبّت
چلنا ہوگا تجھ کو سنبھل کے

دیکھ کے ان کو ساتھ ہمارے
دُور کھڑی ہے دُنیا جل کے

شوقؔ جو ان سے غم ملتے ہیں
بن جاتے ہیں شعر غزل کے

○

عجیب بات ہے بارش میں جل گیا سورج
اور اپنی راکھ کسی مُنہ پہ مل گیا سورج

"ہے داغ داغ اُجالا تو شب گزیدہ سحر"
کچھ ایسی چال اُجالوں سے چل گیا سورج

پھر ایک بار تو ایسا ہوا کہ جنگل میں
ابھی نکل ہی رہا تھا کہ ڈھل گیا سورج

بڑا غرور تھا اُس کو کہ ہے مصاحبِ نور
ہمارے دور میں کتنا بدل گیا سورج

کِرن کِرن اُسے ڈھونڈا کہیں پتہ نہ مِلا
غزل کے روپ میں اے شوقؔ ڈھل گیا سورج

اک حسینہ کبھی جو آتی ہے
کتنی یادوں کو ساتھ لاتی ہے

آپ ہی آپ مسکراتی ہے
چاندنی پیار میں نہاتی ہے

قربتوں کے دیئے سلگتے ہیں
زندگی بھی ملہار گاتی ہے

بھیگے موسم، مہکتی خوشبو میں
ہر ادا دھوم سی مچاتی ہے

آرزوؤں کے دیپ جلتے ہیں
وہ کچھ اِس طرح گنگناتی ہے

شوق جب دھڑکنیں غزل خواں ہوں
خامشی بھی صدا لگاتی ہے

اک اجنبی سہی لیکن وہ جانتا ہے مجھے
خیال پڑتا ہے پہلے کہیں ملا ہے مجھے

اب آ گئے ہو تو بیٹھو زباں نہ کھلواؤ
میں جانتا ہوں ہر اک بات کا پتہ ہے مجھے

وہ جس کے بارے میں اتنی حکایتیں پھیلیں
اُسی کا خط ہے اُسی نے لِکھا ہے مجھے

عجیب شخص ہے تنہا مِلے تو کچھ نہ کہے
نظر بچا کے جو محفل میں دیکھتا ہے مجھے

نئی غزل کے در و بام کتنے روشن ہیں
کبھی کبھی تو یہ احساس بھی ہوا ہے مجھے

جنابِ شوقؔ کا کہنا بجا سہی، لیکن
میں پوچھتا ہوں زمانے نے کیا دیا ہے مجھے

لہو آنکھوں سے دِل کا بہہ رہا ہے
یہی شاید محبّت کا صِلہ ہے

بس اِتنی بات پھر کہنا پڑا ہے
نتیجہ ہر بُرائی کا بُرا ہے

اُتر آئے ہیں وہ محسن کُشی پر
الٰہی! کیا زمانہ آگیا ہے

بنالے اپنی ہمّت ہی کو رہبر
اگر منزل کا جلوہ دیکھنا ہے

کہیں گر موت مِل جائے تو پوچھوں
کہ اُس کو زندگی سے کیا گِلہ ہے

جناب شوقؔ موت اور زندگی میں
فقط دو ہی قدم کا فاصلہ ہے

○

دن میں اِک ماہتاب دیکھا تھا
آپ کہتے ہیں خواب دیکھا تھا

دیکھ کر آئینہ بھی شرمائے
ہم نے ایسا شباب دیکھا تھا

خواب کی وادیوں کا عالم تھا
اُن کو جب بے حجاب دیکھا تھا

اپنی سانسوں کے آس پاس کہیں
اک مہکتا گلاب دیکھا تھا

اُن کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہا
شوقؔ نے دِن میں خواب دیکھا تھا

○

ہماری زندگی، کیا زندگی ہے
خوشی کم، آرزو مہنگی پڑی ہے

تمہاری یاد کی پرچھائیوں سے
کتابِ دل میں جیسے روشنی ہے

مرے پیشِ نظر کارِ جہاں ہے
اُنھیں محفل سجانے کی پڑی ہے

جہاں میں کیا کمی ہے دوستوں کی
مگر اخلاص کی سب میں کمی ہے

لکھا ہے شوق اوروں نے بھی جس کو
وہی اک بات تم نے بھی لکھی ہے

○

یوں ترے غم کے سلسلے سے ملے
کیا خموشی تھی بولتے سے ملے

مُنہ چھپانے لگی ہے تنہائی
آئینے جیسے ٹوٹتے سے ملے

گھر کے افراد بھی بسا اوقات
چشمِ ساغر میں واہمے سے ملے

ہم ملاقات کو چلے تھے مگر!!
وہ ملے بھی تو فاصلے سے ملے

ٹوٹتی ساعتوں کے طوفاں میں
لوگ کتنے ہی ڈوبتے سے ملے

زندگانی کی اُلجھنوں کے سبب
ہم بھی اکثر تھکے تھکے سے ملے

خود کو پہچاننے چلے جب شوقؔ
روشنیوں کے سلسلے سے ملے

○

آپ آئے تو جیسے بہار آگئی
زندگی مسکرائی کلی کی طرح

○

زندگی پیار کو ترستی ہے
ہر طرف آگ سی برستی ہے

روز بڑھتی ہوئی یہ مہنگائی
ہر ضرورت کو جیسے ڈستی ہے

لب ترستے ہیں مسکرانے کو
غم سے آباد دِل کی بستی ہے

ذات، زن اور زمین کے جھگڑے
یہ تجارت بہت ہی سستی ہے

کل جہاں شوق پھول کھلتے تھے
آج وحشت وہاں برستی ہے

○

پھر وہی اگلے سوالات اب کے
جایئے بنتی نہیں بات اب کے

لوگ تقسیم ہوئے ذاتوں میں
آدمیّت کی کہاں بات اب کے

آپ کہتے تھے اُجالا ہوگا
لَوٹ آئی ہے وہی رات اب کے

راستے اپنا چلن بھول گئے
ہم نے دیکھی ہے وہ برسات اب کے

ایسے حالات میں کیا رسمِ جنوں
نہ رہی عزّتِ سادات اب کے

ایک اک لمحہ ڈراتا ہے مجھے
سہمے سہمے سے ہیں جذبات اب کے

روشنیٔ شوق نہ ہونے پائی!
اور کجلا گئے حالات اب کے

○

ہر جواب کے پیچھے فلسفہ نہیں ہوتا
کیوں اُلجھتے رہتے ہو بے سبب سوالوں میں

زخموں کو بھول جاؤ، نیا سال آگیا
باتیں نئی سناؤ، نیا سال آگیا

بدلا لباس وقت تو چہرے دمک اٹھے
جھومو، خوشی مناؤ نیا سال آگیا

پھر بزم آرزو میں چراغاں کا جشن ہے
دیوار و در سجاؤ، نیا سال آگیا

مہکی ہوئی فضا ہے تو نکھرا ہوا شعور
اب تم بھی گنگناؤ نیا سال آگیا

سازِ طرب پہ رقص میں لاؤ حیات کو
ہر غم کو بھول جاؤ نیا سال آگیا

اے شوقؔ! اختلاف کی باتوں کو بھول کر
سب کو گلے لگاؤ، نیا سال آگیا

موسم بدل گیا ہے پھر آتی ہیں گرمیاں!
پھر دیکھئے کہ دھوم مچاتی ہیں گرمیاں

کولر ہوں یا کہ خس کے ہوں پردے پڑے ہوئے
چھکے بڑے بڑوں کے چھڑاتی ہیں گرمیاں

تنہائیوں میں لطف نہ محفل میں ہے مزہ
وہ حبس ہے کہ ہوش اڑاتی ہیں گرمیاں

زردار یا غریب، پریشاں نہیں ہے کون
سب کو جلال اپنا دکھاتی ہیں گرمیاں

آنچل جھلس رہے ہیں تو چہرے اداس اداس
غنچہ لبوں کو خوب جلاتی ہیں گرمیاں

جنگل ہو یا کہ شہر کہاں ہے نجات شوق
دیوانہ آدمی کو بناتی ہیں گرمیاں

○

اتنے برس تو گزرے یونہی ہنسی خوشی میں
اُفتاد آپڑی ہے اکیسویں صدی میں

ماحول جل رہا ہے، ہر شئے سُلگ رہی ہے
موسم بدل رہا ہے، کیا لُطف چاندنی میں

احساس، عزم، ہمت جوہر ہیں فی الحقیقت
کیا کچھ نہیں رکھا ہے دو روزہ زندگی میں

سنجیدہ ہورہے ہو اور غور کر رہے ہو!
ویسے ہی ہم نے کہہ دی اک بات دل لگی میں

کتنے ہی تجربوں سے گزرا سخن ہمارا
اک شہرِ آرزو ہے اردو کی شاعری میں

فطرت شناس نظریں، ہر شئے کو جانچتی ہیں
ہم نے بھی شوق دیکھا اک حُسن سادگی میں

قطعات

تذکرے صبحِ بہاراں کے سُناتے جاؤ
آرزوؤں کے دریچوں کو سجاتے جاؤ
شوقِ صحرا میں بھی مہکاؤ تمنّا کے گلاب
دِل کی آواز کو تقدیر بناتے جاؤ

○

جشنِ آزادیٔ جمہور مناتے جائیں
زندگانی کے در و بام سجاتے جائیں
عزم و ہمّت کے چراغوں کا اُجالا کرکے
پرچمِ ہند کی توقیر بڑھاتے جائیں

○

شدّتِ یاس کو جینے کا سہارا سمجھا
آمدِ غم کو مسرّت کا اشارا سمجھا
دُوریوں نے مجھے منزل کا تصوّر بخشا
کہیں طوفاں نظر آیا تو کنارا سمجھا

○

بات مصری کی ڈلّی ہے لوگو!
بات نوخیز کلی ہے لوگو!
بات پتھّر کو بھی پگھلاتی ہے
بات سے بات چلی ہے لوگو!

○

خزاں کے دشت میں غنچے کھلائیں گے ہم لوگ
ہزار غم ہو مگر مسکرائیں گے ہم لوگ
دلوں سے دور کریں گے اندھیرے نفرت کے
محبتوں سے اُفق جگمگائیں گے ہم لوگ

○

دَرد و غم کی سُلگتی ہُوئی دھوپ ہے
آج کل زندگی جیسے بہروپ ہے
جھوٹ سچ ہو چکا، سچ کہ مصلوب ہے
شوقؔ صاحب عجب رنگ اور روپ ہے

قطعہ

(بہ یادِ شاؔذ تمکنت)

محفلِ شعر و سخن نم دیدہ ہے
شاؔذ سا ماہِ منوّر چل بسا
جس کے دم سے شہرِ دل آباد تھا
کیا کہیں کیسا سخنور چل بسا

○

... پہلے مجموعۂ کلام "بدلتے موسم" پر چند تبصروں کے اقتباسات

○ جو کتاب کسی ریاستی اردو اکیڈمی کی اعانت سے شایع ہوتی ہے اُس کے بارے میں ایک بات کم ازکم یہ طے شدہ ہوتی ہے کہ وہ کتاب محض اس کتاب کے مصنّف کی ہی نگاہ میں لائق اشاعت نہیں بلکہ کچھ ایسے لوگوں کی رائے میں بھی اشاعت کے لائق ہے جو کسی اکیڈمی کے ذمّہ دار ممبر ہیں اور جنھوں نے غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یہ کتاب نہ صرف شایع ہونی چاہیئے بلکہ اکیڈمی کو اس سلسلے میں اعانت بھی کرنی چاہیئے۔ مومن خاں شوقؔ کا مجموعۂ کلام "بدلتے موسم" آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی اعانت سے شایع ہوا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے قاری کو مایوسی نہیں ہوتی وہ عہدِ حاضر کی شعری روایتوں کے شاعر ہیں۔ آج موضوع اور بیان کی سطح پر شاعری میں جو تبدیلیاں آچکی ہیں ان کا کلام ان ہی تبدیلیوں کا حامل ہے۔

مُبصر: اسلم پرویز

ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی تبصرہ نمبر ۲۲ فروری تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء

○ "بدلتے موسم" مومن خاں شوقؔ کا شعری مجموعہ حیدرآباد اسکول کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خیال کو اہمیت زیادہ دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل بجائے نثری نظم اور آزاد نظم کہنے کا رجحان غالب ہے۔ اس مجموعے کو سجانے میں بھی ایک حمد، ایک نعت، چھ قطعات تقریباً

پچاس غزلیں اور ساٹھ نظمیں شامل ہیں۔

ابتداء میں جناب شاذ تمکنت نے مومن خاں شوقؔ کو نئی فکر اور نئے لہجے کا شاعر بتایا ہے۔ آخر میں اختر حسن صاحب کے تاثرات ہیں۔ شوقؔ صاحب کے یہاں بھی نظموں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے جس میں انسان کے داخلی کرب کا اظہار بہت اچھوتے انداز میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں ہر موضوع کا نفسیاتی تجزیہ بڑی سنجیدگی اور ہوش مندی کے ساتھ ملتا ہے۔ "اُلجھن" "نئے سال میں" "نئی کونپل" "ملاقات" "ایک ایکٹ کا ناٹک" "حسن کی خوشبو" اور "گھٹن" بہت ہی خوبصورت نظمیں ہیں جو ذہن پہ دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔

مُبصر: جلال انجم کرم علی (میرٹھ)

"روشن ادب" دہلی مارچ ۱۹۸۳ء

○ "بدلتے موسم" حیدرآباد کے نوجوان سخن ور مومن خاں شوقؔ کی شعری تخلیقات کا اولین مجموعہ ہے۔ چونکہ شوقؔ نے عوام کے جذبات و احساسات کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے اسی لیے ان کی شعری تخلیقات فلسفیانہ اور فکر و فن کے لحاظ سے بوجھل نہیں۔ غزلوں میں بھی انھوں نے اس کے مانوس آداب اور طرز و اسلوب کو نبھاتے کے باوجود احساسات کی صداقت اور جذبات کی متانت کو برقرار رکھا ہے۔ اُن کے نت نئے تجربے اور لامتناہی تجسّس کسی دن اُن کے لیے منزلِ مقصود کی راہ ہموار کر دیں گے۔

نظموں میں "گُلِ تر" "اُلجھن" "پرواز" "عبادت" "دھند کا ایک منظر" وغیرہ شاعر کی انفرادی فکر کی آئینہ دار ہیں اور ہم بھی حضرت شاذ تمکنت کی اس رائے سے متفق ہیں کہ "عشق و مُزاولت" آگہی و تجربہ کا یہ سلسلہ

یونہی جاری رہے تو یقیناً شوق کے قلم سے کوئی یادگار فن پارہ ٹپک پڑے گا۔

پندرہ روزہ "قومی راج" بمبئی

۱۰؍ستمبر ۱۹۸۲ء

○ مومن خاں شوق کا اولین مجموعۂ کلام "بدلتے موسم" برق رفتار حالات اور اقدار کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک درد مند اور انسان دوست شخصیت اُبھرتی ہے جو زندگی کے مثبت اور منفی اقدار کی کہانی بیان کرتی ہے ان کی شاعری میں اعتماد کی فضا ہر سو جاری و ساری نظر آتی ہے۔ چند ناقابلِ فراموش شخصیات، قومی تہوار اور سرکاری پالیسیوں کے علاوہ معاملاتِ عشق اور مختلف پیچیدہ عصری مسائل، نظموں کے موضوعات ہیں جن کو شاعر نے عوامی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔

نظموں کے برعکس غزلوں میں بالخصوص ۱۵ سے ۱۲۸ صفحات پر پھیلی ہوئی چودہ غزلوں میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ ایک حمد، دو نعت، دو ترائیلے اور چھ قطعات بھی شاملِ کتاب ہیں۔ کتابت، طباعت، سرورق سب عمدہ ہیں۔

مُبصر: ملنسار اطہر احمد

روزنامہ "سالار" بنگلور ۲۰؍جون ۱۹۸۲ء

○ مومن خاں شوق تقریباً دس سال سے شاعری کر رہے ہیں۔ اس مختصر سے وقفے میں انھوں نے اُردو شعر و شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ آپ کا شعری سفر جاری ہے آپ منزل بہ منزل بڑھ رہے ہیں اور راستے میں "ادبی خزانہ" بھی لٹاتے جا رہے ہیں۔ شوق کی شاعری میں جو چیز سب سے

پہلے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے وہ ان کا انوکھا لہجہ اور انوکھی فکر و نظر ہے

کل شوق سے اپنی بھی ملاقات ہوئی تھی ؛ نظموں میں نئی فکر ہے لہجہ بھی جدا ہے

لکھی گئی غزل تو سخن بولنے لگا ؛ لہجہ ہماری فکر کا رس گھولنے لگا

پھر ان کی شاعری میں ہندی اور اردو کا حسین گنگا جمنی سنگم بھی تاثر چھوڑتا ہے۔ شوق کی قوتِ مشاہدہ کافی تیز ہے۔ قلم کی سحر کاری اور تجربات کی آنچ ان کی شاعری کو مزید پختہ بناتی جائے گی۔ اس طرح اردو شعر و ادب میں چند فن پاروں کا یقینی اضافہ ہو جائے گا۔ شوق کے فکر و فن، زبان اور لہجے کی سادگی پر سبھوں کا جی مرنے کو چاہتا ہے۔ غزلوں، نظموں، گیتوں اور قطعوں کا اکثر و بیشتر اشعار میں بڑی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ نظم "ساون آیا" اور "حمد" اس قابل ہیں کہ انھیں بچوں کی درسی کتابوں میں جگہ ملے۔

مُبصر: اسحاق ایوّبی

ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد، دسمبر ۱۹۸۴ء

○ حیدرآباد کے نئے شاعروں اور شعر و ادب کے "بدلتے موسم" میں جناب مومن خاں شوق اپنی تازگیٔ فکر، ندرتِ خیال، نظم، غزل اور گیتوں کے البیلے اور خوشگوار اسلوب کے باعث پڑھے لکھے حلقوں میں توجہ کے مستحق سخنور قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ شاعروں اور شعری مجموعوں کی بہتات میں بھی یہ مجموعہ قاری کے ذوقِ نظم و غزل کی دل بستگی کو روا رکھتا ہے۔ مومن خاں شوق کا یہ مجموعہ طباعت، کتابت، گٹ اپ اور جدید شعری محاسن کا خوشگوار موسم قرار پاتا ہے جس کا مطالعہ اچھی شاعری سے استفادہ کے مصداق ہوگا۔ نظمیں، گیت، ترائیلے اور قومی و موضوعاتی نظمیں وحدتِ تاثر کا اچھا اظہار ہیں۔ (ماہنامہ "آندھرا پردیش" حیدرآباد اکتوبر ۱۹۸۶ء) ●●